R. No. [illegible] — Regd. No. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone N
Telegrams "ANJUMAN"

قیمت

جلد ۲۲ - شمارہ ۷ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ فروری ۱۹۶۳ء

نادرہ سیتاپوری

ریاض خیرآبادی کی ایک غیر معروف نظم

ریاض خیرآبادی کے کلام کا ایک بڑا حصہ "ریاض رضواں" میں یک جا کر دیا گیا ہے اور کچھ انتخابات علیٰحدہ سے بھی شائع ہوئے ہیں پھر بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی ریاض کا ایسا کلام بھی موجود ہے جو عام دسترس سے باہر ہے!

ریاض نے جب گورکھپور چھوڑ کر لکھنؤ کی طرف مراجعت کی تو ان کے سامان کا ایک قیمتی حصہ راستے میں تلف ہو گیا جس میں ان کی تخلیقات کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی تھا۔ بہت جستجو کی گئی، لیکن کچھ ہاتھ نہ لگا۔ مدت العمر ریاض اس حادثۂ جانکاہ کو یاد کر کے تڑپا کیے!

ریاض کا موجودہ مجموعۂ کلام "ریاض رضواں" اسی زخم جگر کا اندمال ہے۔ جس کا بڑا حصہ بقول رئیس احمد جعفری "ایک پیسہ فی غزل" کے حساب سے فراہم کیا گیا تھا۔ غالباً سنہ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں سر مہاراجہ محمد علی محمد خاں مرحوم (آف محمود آباد) کو، ریاض کے کلام کی اشاعت کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ ریاست محمود آباد کے جس پریس میں سر مہاراجہ مرحوم کے والد ماجد سر امیر الدولہ بہادر (ناظر) کا کلیات چھپا تھا، وہ بہت دنوں سے بے کار پڑا ہوا تھا۔ پریس اور اس کا تمام متعلقہ سامان ریاض کو عطا کر دیا گیا اور ریاض نے سیتاپور میں "امیر المطابع" کے نام سے ایک مطبع قائم کر دیا۔ کچھ دنوں تک کلام ریاض کی طباعت اور اشاعت کی گرما گرمی رہی لیکن سر مہاراجہ سیاسیات میں کچھ ایسے الجھ گئے کہ پھر انھیں اس کا خیال بھی نہیں رہا ۔۔۔ بات رفت گزشت ہو گئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء یا سنہ ۱۹۲۲ء میں ریاض نے مایوس ہو کر "امیر المطابع" بھی بند کر دیا ۔۔۔ اور یہ قصہ کچھ اس طرح ختم ہو گیا جیسے کبھی اس کا ذکر ہی نہیں تھا۔

اس مایوسی کے باوجود عرصے تک ریاض ان منتشر اوراق کو سمیٹا کیے۔ شاید "سعی لاحاصل" کے طور پر ۔۔۔ لیکن اسی عرصے میں گورکھپور اور حیدرآباد دکن سے کچھ آوازیں بلند ہوئیں، اور مرنے سے ڈیڑھ دو سال پہلے ریاض نے وہ ساری کائنات قاضی تلمذ حسین کو حیدرآباد دکن بھیج دی، جو اس وقت تک جمع ہو چکی تھی! قاضی صاحب نے کافی محنت سے "ریاض رضواں" کی ترتیب و تدوین کی۔ مگر یہ مجموعہ ابھی چھپا بھی نہ تھا کہ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء میں ریاض اللہ کو پیارے ہو گئے!

"ریاض رضواں" اگرچہ ریاض کا جامع کلیات ہے لیکن اس کے باوجود اسے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ ریاض کے آخری ایام زندگی کا کلام تو اس میں ہے ہی نہیں! اس کے علاوہ اگر جستجو کی جائے تو ایسا کلام اور بھی فراہم کیا جا سکتا ہے جو اب بھی عام نگاہوں سے اوجھل ہے مثلاً بھوپال کے ایک مطبوعہ گلدستۂ مشاعرہ (آئینۂ مشاعرہ مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ سنہ ۱۹۱۰ء) میں ریاض کا جو دو غزلہ شامل ہے اس میں مندرجۂ ذیل اشعار ایسے ملتے ہیں، جو "ریاض رضواں" میں نہیں ہیں۔

کہیں جانا نہ پڑا اٹھ کے تری حسرت سے
گوشۂ قبر مری، حشر کا میداں نکلا
تھا وہ ارمان مرا، یا کوئی ارمان ترا
راز کی طرح مرے دل میں جو پنہاں نکلا

اسی طرح ریاضؔ کی ایک نظم، جو غیر مطبوعہ تو نہیں ہے لیکن سمجھنا اسے غیر مطبوعہ ہی چاہیئے ــــــ "ریاض رضواں" میں شامل نہیں ہے۔ یہ نظم جس کا عنوان ہے "نظم بہ تقریب تبادلۂ جناب مرزا محمد حسن صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر سیتاپور" خود ریاضؔ کے "امیر المطابع" میں اشتہار کی طرح فل سکیپ سائز پر چھپی تھی! اس پر کوئی سن وسال یا تاریخ نہیں ہے البتہ "پریس لائن" کے نیچے اعداد میں "دو سو" لکھا ہوا ہے جو یقیناً اس اشتہار کی تعداد طباعت کو ظاہر کرتا ہے اور قیاس یہی ہے کہ یہ دو سو اشتہار ہی الوداعی تقریب میں تقسیم کردیے گئے ہوں گے جس کے لئے یہ نظم لکھی گئی تھی! ذاتی طور پر مرزا محمد حسن کے بارے میں میری معلومات کچھ بھی نہیں ہیں، اتنا ہی سننے میں آیا ہے کہ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۰ء کے مابین یہ سیتاپور میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر مامور رہے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، پڑھے لکھے باذوق! کسی زمانے میں گورکھپور میں بھی رہ چکے تھے ریاضؔ سے ان کے مراسم کا آغاز بھی غالباً وہیں سے ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے یہ تعلقات کچھ گھریلو قسم کے ہوگئے تھے۔ "ریاض رضواں" میں چند ایسے قطعات تاریخ بھی ملتے ہیں جو مرزا محمد حسن کے افراد خاندان کی اموات پر ریاضؔ نے لکھے تھے۔

یہ نظم ریاضؔ کی ایک سیدھی سادی نظم ہے جس میں ذاتی تاثرات کے سوا کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ اس نظم سے اتنا اور بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ریاضؔ بے جا خوشامدانہ تعریف اور خواہ مخواہ قصیدہ خوانی سے بہت حد تک گریز کرتے تھے۔ یہ نظم "ریاضیات" کے سلسلے کی ایک دلچسپ کڑی ہے جو من و عن درج ذیل ہے۔ اصل مطبوعہ نظم میرے پاس محفوظ ہے۔

بہت ہی تیرہ زمانے میں ہے فراق نامود
بہت ہی سخت ہے دنیا میں دن جدائی کا
وہ دوست آپ کا ہو یا عزیز کوئی ہو
جو بس چلے نہ کبھی کوئی ہو کسی سے جدا!
تعلقات سے کوئی نہیں یہاں آزاد
کوئی نہیں ہے جو اس سلسلے میں ہو جکڑا
نہیں لگاؤ کہ تخصیص حسن صورت سے
اثر فزا ہے بسوا اس سے! حسن سیرت کا
غم فراق بھی الفت کے ساتھ ہے مخصوص
بہت بری یہ بلا ہے بچائے اس سے خدا!
پھر ایسے شخص کی فرقت جو ہر طرح ہو عزیز
دلوں میں جس کی جگہ ہو۔ دلوں میں گھر جس کا
بطرز خاص! حکومت ہر ایک کے دل پر
جو منکسر ہمہ تن ہو، جو خلق سر تا پا
معاصرین کو جس پر نہ رشک ہو وہ عجز
وہ عاجزی جو کرے سر غرور کا نیچا
ہوئی نہ پائے قلم کو کبھی ذرا لغزش
جگہ سے ہٹ نہ سکا جس کے عدل کا پایا
مروت آنکھوں میں، سیرت میں حسن، بات میں لطف
سخن میں صدق! طبیعت میں حلم، دل میں صفا
خیال یہ نہ عدالت ہے عدالت ناز
کرے ادائے تغافل نہ فیصلہ سب کا
مقدمات کو جو مثل زلف یار کا طول
نہ فرد حکم مسلسل ہو! جس سے دام بلا
غریب، امیر، بڑے، چھوٹے! سب برابر ہوں
کبھی سنے نہ کسی کی گذارش بے جا
نہ بیل سکے کبھی حکمت! جو آئے لقمان بھی
نظر نہ کرسکے میلی خزانہ قارون کا
باعتبار حکومت! اس امتیاز سے وہ
نظر حمایت حق پر، تو دل میں خوف خدا
ہم ایسے شخص کو کس طرح الوداع کہیں
جو ہو کے ہم سے جدا بھی، نہ ہوسکے گا جدا
نہ جاسکیں گے، کہیں جائیں میرزا صاحب
کہ شکل ان کی ہے اب اور آئینہ دل کا
بنے گا محفل احباب میں جناب کا ذکر
صدائے خندۂ گل، شور قلقل مینا
کریں گے یاد "محمد حسین صاحب" کو
رہے گا ذکر "محمد حسین صاحب" کا
ہمیشہ دیں گے دعا دل سے اہل سیتاپور
دعا بھی ایسی، جسے کہیے مستجاب دعا
وہ خوش نصیب ہے جو سب میں نیکنام رہے
کہ نام نیک کو دنیا میں ہے ریاضؔ بقا
دعا ہے ساتھ ترقی کے آئیں جائیں آپ
ہمیشہ دور حکومت رہے اے میرے خدا

ضروری گزارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسالِ زر "جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے پتے پر فرمایئے۔ بعض خطوں پر منصب کی بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوط کی تعمیل میں مختلف وجوہ سے دیر ہو جاتی ہے جس کے نام خط لکھا گیا ہے اگر وہ کارکن چھٹی پر ہو، بیمار ہو، دورے پر ہو یا عدم موجودگی کی کوئی اور صورت ہو تو وہ ڈاک کھلتی نہیں اور اہم خطوط کا جواب بر وقت نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے خط

"جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ"

کے پتے پر بھیجئے۔ شکریہ

ہماری زبان

۱۵ فروری سنہ ۱۹۶۳ء

غالب کی یاد میں

آج غالب کے انتقال کو چورانوے سال ہو گئے۔ اُن کی صد سالہ برسی میں صرف چھ سال باقی ہیں۔ یہ تقریب جس پیمانے پر منانا چاہئے اور اس کے لئے جو کام کرنا چاہئے، اس کے متعلق کئی موقعوں پر ہم اظہار خیال کر چکے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن کے توجہ دلانے پر دہلی میں ایک مرکزی غالب سینٹنری کمیٹی بن گئی ہے جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین اور سکریٹری جناب احمد محی الدین ہیں۔ اس کمیٹی نے سنہ ۱۹۶۹ء کے لئے پروگرام کا ایک خاکہ تیار کر لیا ہے اور اس سلسلے میں ساہتیہ اکاڈمی اور دوسرے ادبی اداروں سے خط و کتابت جاری ہے۔ ملک بھر میں اور دُنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جلسے کرنے کے لئے تو ابھی بہت وقت ہے لیکن اُردو دوستوں کو اگر غالب کی عظمت کو دُنیا سے منوانا ہے تو انھیں ابھی سے کام شروع کر دینا چاہیئے۔

یوں تو اُردو میں اور بھی بڑے شاعر ہیں مگر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ غالب کی اپیل سب سے زیادہ ہے۔ اس کے حلقۂ احباب میں ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے۔ نوابوں سے لے کر معمولی افراد تک ہر طبقے میں اس کے جاننے والے اور اس کی قدر کرنے والے موجود تھے۔ ان میں عالم بھی تھے اور شاعر بھی، زاہد بھی اور رند بھی، ہندوستانی بھی اور انگریز بھی۔ اس کی شاعری میں یہ دُنیا بھی تھی اور وہ دُنیا بھی، آہ بھی اور واہ بھی؛ مایوسی کے بادل بھی اور اُمید کی کرنیں بھی۔ فکر کی روشنی بھی اور جذبے کی گرمی بھی، فطرت کی عکاسی بھی اور نفسیات انسانی کی رنگا رنگ کیفیت بھی، مزاح کی چاشنی بھی اور طنز کے ہلکے نشتر بھی۔ وہ زبردست تخیل بھی رکھتا تھا اور حقائق کا احساس بھی۔ فضا میں پرواز بھی کرتا تھا اور زمین پر سیدھے سبھاؤ چلنا بھی جانتا تھا۔ وہ پُرانوں میں پُرانا اور نئی پود کے لئے نیا تھا۔ وہ زندگی کی تلخی اور زمانے کی ناسازگاری کا رونا بھی رو سکتا تھا اور اپنے اوپر ہنس بھی سکتا تھا۔ وہ رنگ بہار ایجادی بیدل سے اپنے کلام کو گنجینۂ معنی کا طلسم بھی بنا سکتا تھا اور سہل ممتنع میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ وہ جس طرح شعر میں اپنی نظیر آپ تھا اُسی طرح نثر میں بھی منفرد تھا۔ اُس کا ہاتھ کبھی خالی نہ ہوا، شعر نہ کہے تو خط لکھے، خط نہ لکھے تو باتیں کیں۔ وہ صرف اپنے دور کا آدمی نہ تھا، ہر دور کا آدمی تھا۔ وہ نہ ہوتا تو حالی و اقبال کہاں ہوتے اور سرسید کیا کرتے۔ اور یہ لوگ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔

آج کے درد و داغ، سوز و ساز اور آرزو و جستجو کو جو تسکین غالب کے کلام میں ملتی ہے وہ کسی دوسرے کے کلام میں نہیں۔ غالب کے خطوں میں جو بات ہے وہ اب تک کسی دوسرے مکتوب نویس کو نصیب نہیں ہوئی۔ غالب ہماری اتنی بڑی دولت ہے کہ اس سے ساری دنیا کو آشنا کرانا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ نہ صرف ہندوستان کی ہر اہم زبان میں، بلکہ دُنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں بھی غالب کے منتخب کلام کا ترجمہ شائع ہو۔ یوں علمی دنیا خود بخود غالب کی طرف متوجہ ہو رہی ہے مگر ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے۔ آج ایشیا، یورپ، امریکہ میں کئی جگہوں پر اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ جگہ جگہ اُردو ادب پر کچھ کام بھی ہو رہا ہے، ان سے ربط قایم کر کے غالب کے کلام کا ترجمہ دنیا کی بڑی زبانوں میں کرانا چاہیئے۔ یہ کام اُردو دوستوں کا ہے، حکومت کا جو کام ہے وہ حکومت تو ہمارے توجّہ دلانے پر کرنے کے لئے آمادہ ہو ہی جائے گی۔

اور ہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ غالب کی زبان کا حق بھی اُس کے گھر میں، ابھی اُسے پوری طرح نہیں ملا ہے۔ اُردو جیسی قومی زبان کو جس میں ہماری مشترک تہذیب کا سارا خزانہ موجود ہے، زبانی ہمدردی کی ضرورت نہیں، اسے عملی سہارے کی ضرورت ہے۔ صرف یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں اُردو ادب پڑھانے سے ہی کام نہیں چلے گا، اس کی بنیاد ابتدائی اور ثانوی اسکولوں ہی میں مضبوط ہوتی ہے۔ ریاستی حکومتوں کو اس کا انتظام کرنا ہے اور اُردو دوستوں کو اس کا انتظام کرانا ہے۔ آگے چل کر ایک اُردو یونی ورسٹی بھی قایم کرنا ہے مگر اس سے پہلے اسے اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال بچھانا ہے جن سے یونی ورسٹی تک طلبہ پہنچ سکیں۔ حالات کی ناسازگاری کا رونا روتے رہنا پست ہمتوں کا کام ہے۔ پیرِ رومی نے مرید ہندی سے غلط نہیں کہا ہے ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

انجمن ترقی اُردو ـ کلٹی، ضلع بردوان

یوم جمہوریت کے موقع پر انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام جناب سردار دیا سنگھ صاحب صدر انجمن ترقی اُردو کلٹی، کی صدارت میں ایک مشاعرہ روایتی اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا جس میں چینی حملے سے متعلق پانچ تجویزیں اتفاق رائے سے جلسۂ عام میں منظور کی گئیں، اور ہندی اُردو میں مطبوعہ تقسیم کی گئیں۔

امریکا میں اُردو

نئی دہلی، ۱۱ر فروری - ادبی مجلس کی ایک نشست میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے اپنے دورہ امریکہ کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ دو سال میں امریکہ کی دس یونی ورسٹیوں میں اُردو پڑھانے کا انتظام ہو چکا ہے، اور وہاں کے علمی حلقے اُردو ادب میں دل چسپی لے رہے ہیں۔

ہندوستان جا کر اُردو سیکھنے اور تحقیقی کام کرنے کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔ اس وقت دہلی یونی ورسٹی میں ۱۷ امریکی طلبہ اُردو کی تعلیم پا رہے ہیں اور اس تعلیم کی مدد سے ہندوستانیوں کے درمیان رہ کر ان کے رہن سہن کے بارے میں سماجی معلومات جمع کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان میں ایک طالب علم اس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ فیصلے کس طرح کرتے ہیں۔

وس کانسن یونی ورسٹی نے میرؔ اور غالبؔ اور اُردو کے دوسرے بڑے شعرا کے کلام کے ترجمے کرانے کی اسکیم اصولی طور پر منظور کر لی ہے۔ اس کے علاوہ اس یونی ورسٹی نے دنیا بھر کے عجائب گھروں اور کتب خانوں میں موجود ہندوستان کے پرانے مسودوں اور کتابوں کی مائکرو فلموں کے تین سیٹ تیار کرانا منظور کیا ہے۔ ان میں سے ایک سیٹ دہلی یونی ورسٹی کو دیا جائے گا۔

ڈاکٹر فاروقی نے بتایا کہ آج کل امریکہ میں پرانی کتابوں اور مسودوں کو حاصل کرنے کی بڑی زبردست خواہش ہے، اور لائق توجہ نسخوں کے لئے بڑی بڑی قیمتیں ادا کی جاتی ہیں چنانچہ ابتدائی کاتب المشہدی کی سنہ ۱۵۱۵ء کی ایک تحریر کے لئے ۲۶۰۰ ڈالر کی رقم ادا کی گئی۔

بزم جیون کا ادبی اجلاس

سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کے منتخب اجتماع میں ۳۱ر جنوری کو بزم جیون کے زیر اہتمام ادبی محفل منعقد ہوئی، جس کی صدارت ڈاکٹر طاہر علی مسلم نے کی۔ جناب اوج یعقوبی نے اپنا مقالہ "جامی اپنے نگار خانۂ فن میں" پڑھا، جس میں خورشید احمد جامی کے فن کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔

مسٹر اوج یعقوبی نے جامی کی غزل کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں انے گنے شاعروں میں شمار کیا اور بتایا کہ "جامی کا تیشۂ قلم وقت کی چٹانوں سے ٹکراتا اور شرر بناتا رہا۔ تیشہ زنی میں اس کے مقصد کا پسینہ جہاں جہاں گرا زمین نم ہوتی گئی۔ شرارے برسانے والے تیشے کو گلاب کا قلم بنا کر کشتِ شعر میں بونے لگا۔ جامی کو کتنے مضحکوں، مخالفتوں، مایوسیوں اور مشکلوں سے گزرنا پڑا۔ اس مضمون کے بعد صلاح الدین نیر، وقار خلیل، فیض الحسن خیال اور شاغل ادیب نے بھی جامی کے فن اور شخصیت کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اس اجلاس میں جناب عاشق شاہ نے افسانہ "ایک شخص" سنایا جو پسند کیا گیا۔ (فیض الحسن خیال)

جوانوں کے لئے کتابوں کا تحفہ

اُردو کے نوجوان شاعر عشرت کرتپوری نے چینی حملے سے متعلق اپنی تازہ نظموں کا مجموعہ "پاک زمین ناپاک قدم" کی دو سو جلدیں وزیر اعظم کی خدمت میں جوانوں کو بھیجنے کے لئے پیش کیں۔

انجمن تعمیر اُردو دہلی

۳ر فروری ۱۹۶۳ء کو انجمن تعمیر اُردو دہلی کے زیر اہتمام اردو ہال اُردو بازار جامع مسجد دہلی میں ایک ادبی اجتماع منعقد ہوا۔ منشی عبد القدیر صاحب نے صدارت فرمائی۔ تنقیدی پروگرام میں ستیش چندر سکسینہ غالب دہلوی نے غزل اور برج لال جگی صاحب نے نظم پیش کی۔

اختتام پر صوفی زمزم صاحب نے وجد آفریں انداز میں لاجواب غزلیات سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ ان کی غزلوں کو داد و تحسین کے بے پناہ شور میں سنا گیا۔

انجمن کی ایک اور نشست بروز اتوار ۱۷ر فروری کو جنوبی ہند کے مشہور صحافی جناب غالب فدائی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب عبد اللطیف صاحب اعظمی نے ایک معلوماتی مقالہ "مولانا آزاد" اپنے معاصرین کے خطوط کی روشنی میں پڑھا جو پسند کیا گیا۔ اعظمی صاحب نے مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی، مولانا عبد الماجد دریا بادی، سید سلیمان ندوی، پروفیسر محمد سرور، موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سید وزیر حسن، سبھاش بوس، عبد الغفار خاں، آصف علی، ڈاکٹر اقبال، مولانا عبد الحق، نواب وقار الملک، مہدی افادی، تیج بہادر سپرو، ٹی۔ بی۔ سپرو، سروجنی نائیڈو، مولانا سیماب اکبر آبادی وغیرہ حضرات کے خطوط کے اقتباسات پیش کئے۔

اس کے بعد جناب جانن گووند پوری نے اپنا پنجابی کلام سنایا۔ بعد ازاں گلزار دہلوی نے اپنی غزل تنقید میں پڑھی۔ (منجانب انجمن تعمیر اُردو دہلی، عشرت کرتپوری)

ضروری اعلان: براہ مہربانی خط کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ — منیجر

حسان بھاکرتی

سرفروشوں کا وطن ــــ ہندوستاں

اے بہادر سرفروشوں کے وطن ہندوستاں
سر پہ تیرے آپڑا ہے جنگ کا بارِ گراں

تو زمانے میں شجاعت کے لئے مشہور ہے
تیرا حق ہے تو جو اوجِ عزم پر مسرور ہے
تیری شہرت بزمِ عالم میں قریب و دور ہے
تو نے بڑھ بڑھ کر دئیے ہیں زندگی کے امتحاں

اے بہادر سرفروشوں کے وطن ہندوستاں
سر پہ تیرے آپڑا ہے جنگ کا بارِ گراں

تو ہمیشہ سے تمام اقوام میں ممتاز ہے
شیروں میں تیرے اب تک قوتِ پرواز ہے
تجھ کو اپنے گود کے پالوں پہ کیا کیا ناز ہے
فاتحِ میدانِ ہمت ہیں ترے بیر و جواں

اے بہادر سرفروشوں کے وطن ہندوستاں
سر پہ تیرے آپڑا ہے جنگ کا بارِ گراں

آج تو ہے چین سے تو مقابل غم نہیں
اک "زمانہ" جانتا ہے تیری قوت کم نہیں
روک دے تیرے قدم دشمن میں اتنا دم نہیں
تو ہے اک موجِ قیامت تو ہے اک سیلِ رواں

اے بہادر سرفروشوں کے وطن ہندوستاں
سر پہ تیرے آپڑا ہے جنگ کا بارِ گراں

پھر زمانے کو دکھا دے اپنی غیرت کا جلال
امنِ عالم کے لئے اب ہاتھ میں خنجر سنبھال
اپنی سرحد سے ہر اک دشمن کو اب باہر نکال
جنگ کا نعرہ لگا اے آشتی کے پاسباں

اے بہادر سرفروشوں کے وطن ہندوستاں
سر پہ تیرے آپڑا ہے جنگ کا بارِ گراں

اُٹھ وطن کی آبرو دشمن کے ہاتھوں سے بچا
آشیاں کو برقِ آتش زن کے ہاتھوں سے بچا
اپنے سرمائے کو اک پرفن کے ہاتھوں سے بچا
برق بن کر پھونک دے تو چینیوں کا کارواں

اے بہادر سرفروشوں کے وطن ہندوستاں
سر پہ تیرے آپڑا ہے جنگ کا بارِ گراں

سلام مچھلی شہری

اپنی دھرتی کے چراغوں کے پرستار ہو تم ـ!

اے علی گڑھ کے جواں سال حسیں شہزادو!
تم نے قسمت بھی جگائی ہے نئی دنیا کی
اور تو صرف تواریخ پڑھا کرتے ہیں
تم نے تاریخ بنائی ہے نئی دنیا کی
تم اُلجھتے ہی رہے راہ کے پیچ و خم سے
تم نے منزل بھی دکھائی ہے نئی دنیا کی
ہم تو بس ایک تصور تمہیں دے سکتے تھے
تم نے جنت بھی سجائی ہے نئی دنیا کی

اپنے پس منظرِ پُرنور کے تم مالک ہو
آج کیا پھر نہ کوئی شمع بقا بخشو گے؟
دیس کے دیپ سے جلتا ہے کنول دنیا کا
محفلِ ہند سے تم دہر کو کیا بخشو گے
رضیہ پھر آئی ہے، پھر آئی ہے رانی جھانسی
خون دو گے انھیں یا رنگِ حنا بخشو گے؟
میں سمجھتا ہوں کہ تم قافلۂ تازہ کو
اک نیا عزم، نیا جوشِ وفا بخشو گے!

اپنی دھرتی کے لئے لالہ و گل ہو لیکن
"چینیوں" کے لئے طوفانِ شرربار ہو تم
کوئی آدرش نیا چاہے تو پھولوں کی مہک
کوئی آدرش سے ٹکرائے تو انگار ہو تم
یوں تو ہر پھول کے عاشق ہو جہاں بھی مل جائے
اپنی دھرتی کے چراغوں کے پرستار ہو تم
روشنی ـ روشنی ـ ہاں روشنی اے شہزادو!
"بزمِ سید" کے دمکتے ہوئے مینار ہو تم
(علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی)

غزلیں

عبدالصمد تپش

نگاہِ شوق کی محرومیوں پہ مت جاؤ — تلاش دیر میں دیکھو کہاں کہاں ٹھہرے
نجانے کیوں تری یادوں کے چمن میں لگے — کبھی لطیف ہے اور کبھی گراں ٹھہرے
میرے آبلہ پائی کی ریت جلتی ہے — ہمیں جو سائے زمانے سے تم جہاں ٹھہرے

سہیل عبدالواحد ماہر جلیسوی

عمر اک انتظار میں گزری — اب تو وعدہ وفا کرے کوئی
بے سبب سامنے نہیں گے — کیوں ہمارا بھلا کرے کوئی
محفلِ غیر میں نہیں ماہر — یوں نہ رسوا کیا کرے کوئی

تنویر سامانی

رباعی

ہم جنگ سے مرعوب نہیں ہو سکتے — طاقت سے بھی مغلوب نہیں ہو سکتے
نیفا ہو کہ لداخ اپنی بھارت کے سبھی — یہ چین سے منسوب نہیں ہو سکتے

وریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

صحتِ زبان

اُردو سے متاثر ہوکر حضرت جگرؔ بریلوی نے یہ کتاب "صحت زبان" لکھی تمام عمر کے ادبی مطالعہ مزاولت کے بعد فصاحت و بلاغت کا جو اندازہ آپ کو ہوا ہے اُس کے پیش نظر آپ نے اُردو کے لفظی جکڑ بندوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے محرک اُردو کے مستقبل کی وسعت و ترقی کے آثار و قرائن بھی ہوئے ہیں جو نظم و نثر دونوں میں رونما ہیں۔ موضوعات میں بھی اصناف سخن میں بھی اور اسالیب میں بھی۔ غزل جیسی رسمی و روایتی صنف نے بھی پُرانی چہار دیواری کو ڈھا دیا ہے اور مختلف کوائف زندگی پر حاوی ہو چلی ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض طبقوں میں شاعری کی مسلمہ پابندیوں، ردیف و قافیہ اور وزن کے اصولوں سے بھی جہاد کیا جا رہا ہے، جہاں یہ مطلق العنانی ہے وہاں ایک گروہ ابھی ایسا بھی موجود ہے جو لکیر کا فقیر بنا ہوا زبان کی وسعت کی طرف سے بالکل بے خبر ہے یا جان بوجھ کر انجان بنا ہے۔ ساری پُرانی زنجیروں کو گلے کا ہار بنائے ہوئے ہے اور اپنے بھیڑوں کے گلے کو پُرانے ہی باڑے کے اندر مقید رکھنے پر مُصر ہے۔ میں نے ایک مشہور اُستاد کو (جن کے سیکڑوں شاگرد ہوں گے) ایک موقع پر کہتے سُنا کہ میں نے کبھی آج تک زندگی کی جگہ زندگانی، شاد کی جگہ شاداں، شیدا اور فدا کی جگہ شیدائی و فدائی وغیرہ استعمال نہیں کئے نہ ان کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ گویا اُردو اُن کے گھر کی لونڈی ہے اس کی زندگی اور نقل و حرکت ان کی انگنائی تک ہی محدود ہے۔ حضرت جگرؔ بریلوی نہ اس غلامی کے قائل ہیں اور نہ اُس آزادی کے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ ہر نظام قدیم میں زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ترمیم اور تبدیلی ہوتی چلی آئی ہے۔ آپ بھی موجودہ حالات کے پیش نظر زبان کی آئندہ ترقی کے لحاظ سے پُرانی قیدوں میں ترمیم کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ استعمال الفاظ و تراکیب میں فصاحت کو آپ مقدم مانتے ہیں، جس کی کسوٹی وجدان ہے۔

"صحت زبان" پر بہت سے ریویو نکل چکے ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے ادیبوں نے آپ کی رائے سے فی الجملہ اتفاق کیا ہے۔ ان میں سے چند کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

حضرت منور لکھنوی ۵ر جولائی ۱۹۵۸ء کے خط میں جگرؔ صاحب کو لکھتے ہیں:-

"صحت زبان کا میں نے فوراً مطالعہ کیا اور اس سے فائدہ اُٹھایا۔ ادیب فاضل اور منشی فاضل پاس کرکے چند اصحاب دقیانوسی قسم کے اعتراضات کا پلندا ہر جگہ لئے پھرتے ہیں اور ان کا کام صرف یہ ہے کہ دوسروں کے کلام پر خواہ مخواہ دقیانوسی قسم کے اعتراضات اُٹھایا کریں۔ آپ نے ایسے حضرات کو خوب مُسکت جواب دیا ہے میں آپ کی اس فاضلانہ تصنیف پر آپ کو مبارک باد ہی پیش نہیں کرتا بلکہ "صحت زبان" کو وہ نسخہ قرار دیتا ہوں جس کے سہارے ایک شاعر یا ادیب آجکل کے زمانے میں جی سکتا ہے اور دقیانوسی قسم کے معترضوں کے ہاتھوں اس کے قتل کے امکانات نہایت محدود ہو جاتے ہیں۔ آپ "صحت زبان" کے معاملے میں تمام صحیح الدماغ شعراء و ادبا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔"

مولانا نیاز فتحپوری "نگار" بابت ماہ اگست ۱۹۵۹ء میں لکھتے ہیں:-

"جناب جگرؔ بریلوی نے اس کتاب میں اُردو زبان کے ایک بڑے متنازعہ فیہ مسئلے پر گفتگو کی ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اُردو زبان کے مرکب الفاظ میں ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کا پیوند درست ہے یا نہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے بعض متروک الاستعمال الفاظ کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں ان سے اس باب میں بالکل متفق ہوں کہ اُردو کے بعض الفاظ جو عہد تاسخ میں متروک قرار دئے گئے قطعاً قابل ترک نہ تھے، کیونکہ بامر مفہوم ان کا بدل کوئی دوسرا لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔

اسی طرح اُردو کے ان بہت سے الفاظ کو جو ہندی، فارسی یا عربی، فارسی الفاظ سے ترکیب کا نتیجہ ہیں غلط نہیں ٹھہرایا، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے کیونکہ زبان کی وسعت کا تقاضا یہی ہے کہ بول چال کے مقابلے میں اصول گرامر کو ترجیح دینا کبھی اہل زبان نے پسند نہیں کیا۔ اس سلسلے میں یہ بات البتہ دیکھنے کی ہے کہ کسی لفظ کا استعمال ذوق پر گراں تو نہیں اور یہ وہ بات ہے جس کا کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا اس کا تعلق صرف وجدان سے ہے۔

جناب جگرؔ نے اس کتاب میں سیکڑوں اسی قسم

کے الفاظ جمع کر دئے ہیں اور ان کے استعمال کی سند بھی کلام اساتذہ سے پیش کر دی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لئے بھی بہت مفید ہے اور امید ہے کہ ملک اس کی قدر کرے گا۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰ر اکتوبر ۵۶ء کے خط میں جگر صاحب کو لکھتے ہیں :-

"میں نے اس کتاب سے بہت کچھ سیکھا"

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی ۱ر ستمبر ۵۸ء کے خط میں جگر صاحب کو لکھتے ہیں :-

"میں نے "صحت زبان" کا مطالعہ کر لیا ہے آپ کے مرکزی خیال سے مجھے کلی اتفاق ہے یہ کتاب آپ کی علمی بصیرت، فن شاعری پر مکمل عبور اور آپ کے اعلیٰ تنقیدی شعور کی حامل ہے کیا اچھا ہو کر ہمارے شاعر جو مور و ملخ کی طرح دنیائے اردو میں پھیلے ہوئے ہیں، فن شاعری پر آپ کی سی بصیرت حاصل کریں۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ "صحت زبان" اردو ادب میں یادگار کارنامہ ہوگی۔"

میں جانتا ہوں کہ جگر صاحب سے اختلاف رکھنے والے بھی ہیں ان میں سے پانچ سات شخصوں کے خطوط بھی آپ کو موصول ہوئے ہیں ان خطوں میں موضوع اختلاف ایک ہی ہے یعنی متروکات کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو لفظ روزمرہ میں نہیں وہ شاعری میں کیوں لایا جائے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ شاعری روزمرہ کے تابع نہ تھی نہ ہو سکتی ہے روزمرہ میں تو صنائع و بدائع تراکیب عطفی و اضافی تلمیحات وغیرہ کا بھی جواز نہیں پھر ان سب کو شاعری سے نکال باہر کیا جائے۔ شاعری میں ایک چیز تعقید ہے جسے عیوب شعر میں شمار کیا گیا ہے مگر بڑے سے بڑے شاعر اور فن کار کا کلام اس سے خالی نہیں بلکہ یہ عیب عام ہے۔ ہر صفحے پر اس کی مثالیں ملیں گی، اور بعض نہایت بھونڈی، اس عیب سے مفر ہی نہیں۔ روزمرہ میں یہ کب جائز ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ اردو کی روز افزوں وسعت و ترقی اور اصول فصاحت کو بھی ذہن میں رکھا جائے یعنی بلند نظری اور وجدان صحیح سے کام لیا جائے۔ لکیر کا فقیر بنے رہنے کا زمانہ گیا۔ معیار تنقید بھی اب بہت بلند ہو گیا ہے اور وسیع بھی۔ تنقید نگار اب لفظی و فروعی باتوں پر زیادہ نظر نہیں ڈالتے شاعر کے نفسیات کا جائزہ لیتے ہیں۔ زندگی کے وسیع جمالیاتی اور آفاقی اصولوں سے ادب کو پرکھتے ہیں۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر "صحت زبان" میں جگر صاحب کے جو معروضات ہیں انھیں دیکھنا ہے اور سمجھنا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی آپ سے اتفاق رائے نہ کر سکے تو نہ کرے بلکہ اور بھی پابندیاں چاہے اپنی زبان و قلم پر لگائے۔

مراسلات

اُردو ٹائپ

(۱)

۲۲ جنوری ۱۹۶۳ء کے شمارے میں ماسکو سے جناب ظ انصاری صاحب کا خط (اُردو ٹائپ سے متعلق) نظر نواز ہوا جس میں موصوف نے پالی گرافک انسٹی ٹیوٹ (ماسکو) میں اُردو ٹائپ کے جوڑ اور میٹرس کا مطالعہ کیا اور کچھ دشواریوں کی نشان دہی کی۔ لیکن اس میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔ امید کہ آپ یا ظ صاحب یا کوئی اور صاحب وضاحت فرما کر ممنون کرم فرمائیں گے۔

یہ درست ہے کہ اُردو ٹائپ میں کل ۴۳۷ یا تقریباً پانچ سو علامات ہیں، جن میں ہر حرف کی ابتدائی، وسطی اور آخری شکلیں بھی شامل ہیں۔ لیکن ظ صاحب نے کل علامات کو چار سے ضرب دے کر علامات کی ایک بڑی بھاری تعداد بنا دی ہے جو کہ ٹائپ سے غیر متعلق حضرات کے لئے کافی اُلجھن اور بدگمانی کا باعث ہو سکتی ہے۔ حالانکہ گزشتہ دو برسوں میں مہاراشٹر کی ٹائپ فاؤنڈریوں (شرف الدین اینڈ سنز اور ادبی پریس بمبئی) نے جو ٹائپ (جسے مصری ٹائپ کہا جاتا ہے اور جس میں معمولی سے حذف و اضافہ کے بعد اُردو کے لئے مقرر کیا گیا) بنایا ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو علامات ہیں۔ دوسری زبانوں کے ٹائپ کے مقابلے میں اس کی کمپوزنگ قدرے دشوار گزرتی ہے۔ لیکن اگر اس میں معمولی سی ترمیم و اضافہ کر دیا جائے تو یقیناً اس کی کمپوزنگ بھی کم وقت اور کم محنت میں ہو سکے گی۔

ظ صاحب نے ایک بات فرض کر لی ہے کہ اُردو ٹائپ کی کمپوزنگ میں زیادہ وقت اور محنت درکار ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ عام رواج نہیں پا سکا ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے اپنے تجربے میں محسوس کیا ہے وہ یہ کہ ہندی یا مراٹھی ٹائپ اور اُردو ٹائپ کی کمپوزنگ میں یکساں وقت اور محنت درکار ہوتی ہے۔ بلکہ ہندی اور مراٹھی ٹائپ (ڈگری والے) کی کمپوزنگ میں اُردو ٹائپ کی بہ نسبت زیادہ محنت اور وقت لگتا ہے۔ اس کا عام رواج نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو اُردو ٹائپ فاؤنڈریاں ہیں، وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، اور یہ جو کچھ تھوڑا بہت ٹائپ تیار کرتی ہیں ان کی قیمت دوگنا یا سہ گنا ہوتی ہے۔ مثلاً پورے مہاراشٹر میں صرف بمبئی میں اُردو کی دو فاؤنڈریاں (شرف الدین اینڈ سنز اور ادبی پریس) ہیں جو زیادہ تر اپنی ضرورت کے مطابق ٹائپ تیار کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں کے نرخ میں اس قدر فرق ہوتا ہے کہ بزنس کے اعتبار سے کبھی کوئی شخص ان کی طرف متوجہ نہیں ہو گا۔ یعنی جو ٹائپ ادبی پریس میں چار یا ساڑھے چار روپے فی پونڈ ملتا ہے، وہی ٹائپ شرف الدین اینڈ سنز کے یہاں چھ یا ساڑھے چھ روپے فی پونڈ ملے گا۔ لیکن چونکہ ادبی پریس ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے اس لئے مکمل نہیں تیار کر سکا ہے، اور شرف الدین اینڈ سنز کا نرخ زیادہ ہونے کے سبب اس طرف کوئی رجوع نہیں کرتا۔ جہاں ایک دوسری پریشانی یہ بھی ہے کہ کسی آرڈر کی تعمیل کے لئے کافی عرصہ درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر ملک میں اُردو کی کم از کم دس ٹائپ فاؤنڈریاں ایسی ہوں جو دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی ہر سائز کا مکمل سیٹ تیار کر سکیں تو اُردو ٹائپ بہت جلد مقبول عام ہو سکتا ہے۔ مثلاً مذکورہ دونوں فاؤنڈریوں میں جو ۱۸ پائنٹ کا ٹائپ تیار ہوتا ہے۔ صرف اسی کا عام استعمال ہو سکتا ہے (جس کے لئے زیادہ جگہ درکار ہوتی ہے جو کہ لیتھو کے مقابلے میں مہنگا پڑنے کی ایک وجہ ہے)۔ اس کے مقابلے میں دوسری زبانوں کے آٹھ، دس اور بارہ پائنٹ کے ٹائپ کا بھی عام استعمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اُردو میں ایک سائز میں صرف ایک ہی قسم کا ٹائپ تیار ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری زبانوں میں ایک ہی سائز میں مختلف قسم کے ٹائپ ملتے ہیں ایسا نہ ہونے کی وجہ سے یہ پریشانی ہوتی ہے کہ جب ہم کوئی چیز اٹھارہ پائنٹ میں کمپوز کر رہے ہوں اور درمیان میں کچھ جلی الفاظ آ گئے تو ہمیں اس کے لئے چوبیس یا چھتیس پائنٹ کمپوز کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ دوسری زبانوں میں بارہ ہی پائنٹ میں خفی، جلی یا ترچھے ٹائپ دستیاب ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے کمپوزنگ میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب رہا نسخ اور نستعلیق کا سوال، تو یہ کوئی ایسی بحث نہیں ہے جس سے ٹائپ کی تیاری میں کوئی رکاوٹ پیش آ سکے۔ جب کہ ہمارے سامنے ہندی و مراٹھی کے مختلف ڈیزائن کے ترچھے ٹائپ اور خصوصاً انگریزی کی چوتھی لپی کی بے شمار قسمیں موجود ہیں، جن پر حرف کا جوڑ بحسن خوبی مل جاتا ہے۔ اور یہی ٹائپ کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم نسخ اور نستعلیق کے خوبصورت سے خوبصورت ٹائپ تیار نہ کر سکیں۔ قرین قیاس ہے کہ اسی نقطۂ نظر کے تحت حیدرآباد کے گورنمنٹ پریس نے نسخ، نستعلیق، خط عثمانی، خط مجیدی اور ثلث وغیرہ ٹائپ دس سے تیس (۳۰) پائنٹ تک ایجاد کئے تھے، جن میں کم سے کم دو سو اور زیادہ سے زیادہ پانچ سو علامات تھے۔ یقیناً یہ اُردو ٹائپ کو خوب صورت اور مقبول بنانے کی ایک بیش قیمت اسکیم تھی۔ لیکن یہ اُردو کی بدقسمتی کہیئے یا اس کے ہمدردوں کا کھوکھلا جذبہ کہیئے کہ اس کے بعد کسی ادارے میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس اسکیم کو آگے بڑھا کر اُردو کی ترقی اور بقا کی ضمانت دے۔

(ہارون احمد)

(۲)

جناب والا!

"ہماری زبان" مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۶۳ء کے صفحہ ۱۲ پر "اردو ٹائپ" کے عنوان سے جناب ظ۔ انصاری کا مراسلہ نظر نواز ہوا۔ اس مکتوب سے ان کوششوں کا علم ہوا جو پالی گرافک انسٹی ٹیوٹ، ماسکو میں اردو ٹائپ کی تیاری کے سلسلے میں جاری ہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہوا کہ یہ ٹائپ کس نوعیت اور تفصیل کا تیار ہوگا اور اس کے استعمال اور چلن میں کیا کیا دشواریاں پیش آنے والی ہیں۔

جناب ظ۔ انصاری صاحب نے اردو کے نوک پلک والے حسین رسم خط کی عنقریب موت کا جو دردناک بیان تحریر فرمایا ہے اس کے پڑھنے سے ہر اردو دوست کو یقیناً رنج و ملال ہوگا۔

اس موقع پر بکمال ادب و انکسار اطلاعاً عرض پرداز ہوں کہ گزشتہ پانچ سال سے میں اپنے طور پر اس کام میں لگا ہوا ہوں اور دن رات کی محنت شاقہ سے میں نے اس سلسلے کی بہت سی مفید معلومات حاصل کرلی ہیں، بلکہ یہ کہنا لاف زنی نہ ہوگا کہ سائنٹفک طرز فکر اور انتھک تحقیق و تدقیق سے بحمد اللہ میں نے جو تھیوری مکمل کی ہے، اس کی رو سے اردو کا ایسا ٹائپ یقیناً ڈھالا جاسکتا ہے، جس میں :۔

۱۔ اردو نستعلیق کے نوک پلک برقرار رہیں۔
۲۔ جس کے استعمال میں ہاتھوں کی محنت کم ہو۔
۳۔ جس کے استعمال میں وقت محنت کم درکار ہو۔
۴۔ جس میں خرچ اور لاگت بھی زیادہ نہ ہو۔

اور جب یہ تمام باتیں یک جا ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کے چلن میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔

فی الوقت میں ایسے راز دار قدردان کی تلاش میں ہوں جو اس تھیوری کو عملی تجربوں کی منازل سے گزارنے اور اس کا پیٹنٹ حاصل کرنے میں اعانت کرسکے کہ مندرجہ بالا مکتوب اور آپ کے فٹ نوٹ پر نظر پڑی۔

میری عین خواہش ہے کہ پالی گرافک انسٹی ٹیوٹ، ماسکو یا کوئی اور ادارہ رضامند ہو تو اپنی خدمات پیش کروں۔

آپ کی ذات گرامی سے قوی امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں میری رہبری اور حوصلہ افزائی فرماکر میری برسوں کی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کو سعی حاصل اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں سرپرستانہ حصہ لیں گے اور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا ممنون و مشکور بنائیں گے۔

فقط۔ زیادہ حد ادب۔

محمد عبد الرحمٰن نجمی
سینئر انگلش ٹیچر، مدرسہ ہائی اسکول

(۳)

بجواب نوٹ ادارہ مندرجہ ہماری زبان ۲۲ر جنوری ۶۳ء صفحہ ۱۲۔ ایڈیٹر کی ڈاک "اردو ٹائپ"۔ ظ۔ انصاری (از ماسکو) عرض ہے :۔

(۱) انگریزی زبان کے ماہنامہ Indian Print & Paper (مطبوعہ کلکتہ) میں آر۔ او۔ وی۔ پلے، ناظم گورنمنٹ پرنٹنگ پریس حیدرآباد کا مضمون The New Nastaliq Type اور نوٹ ادارہ حکومت نظام کے بنائے ہوئے نستعلیق ٹائپ کی وضاحت کرتا ہے۔

(۲) اردو رسم خط مولفہ سجاد مرزا سنہ ۱۹۳۲ء۔ اسی ٹائپ پر تنقید کی گئی ہے اور ٹائپ کی ضروریات بتاتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نستعلیق کا ٹائپ کاروباری نقطۂ نظر سے نہیں بنایا جاسکتا۔ نستعلیق ٹائپ کے نمونوں کا عکس بھی دیا گیا ہے۔

(سجاد مرزا)

دار العلوم خلیلیہ ٹونک میں اردو زبان و ادب

دار العلوم خلیلیہ ٹونک جو علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بہت بڑا مرکز ہے اردو زبان کی خدمت اور نشر و اشاعت میں کسی دوسرے ادارے سے پیچھے نہیں ہے۔ دار العلوم کی تعلیمی زبان اردو ہے۔ مختلف علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان ہی میں دی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء سے جامعہ اردو کے امتحانات کا یہاں سینٹر بنا ہے اور ہر سال اردو کے امتحانات میں اس سینٹر سے کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات شرکت کرتے ہیں۔ اس سال ماہ جنوری میں جو نتائج شائع ہوئے ہیں ان کے مطابق اس سال امتحان دینے والوں کی تعداد ۲۴ تھی۔ ان میں سے ۲۲ طلبہ و طالبات نے کامیابی حاصل کی یعنی نتیجہ ۹۵ فی صدی رہا۔

(حکیم سید ظہیر احمد برکاتی معتمد دار العلوم خلیلیہ)

اُنیسویں صدی کے چند اکبرآبادی رسائل و اخبار

"اُنیسویں صدی میں اُردو کے دو منظوم ماہنامے" کے زیرِ عنوان ایک مضمون نوشتہ جناب میر حسن نورانی نظر نواز ہوا۔ موصوف نے "دامنِ بہار" کے ایڈیٹر کا نام "مرزا نثار حسین" لکھا ہے جبکہ یہ رسالہ "مرزا فدا حسین" مہتمم کارخانہ مہر چیدری کی زیرِ ادارت شائع ہوا کرتا تھا۔ مرزا نثار حسین مطبعے اور رسالے کے مالک تھے۔ دفتر اس رسالے کا "کڑہ حاجی حسن" میں واقع تھا جہاں بنام بدر مطبعے کا مستقر تھا۔ نیز جملہ خط کتابت اسی پتے پر ہوا کرتی تھی۔

محولہ مضمون میں شمارہ ۳ کے پیشِ نظر واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ اس سے پہلے شمارہ ۲ بابت ماہ جون کا طرحی مصرع یہ تھا۔ ع

ہم کو تمہاری بات کا ہے اعتبار کب

دی ہوئی طرح میں رسالۂ پیشِ نظر کے بارہ صفحات پر اٹھائیس شعرائے کرام نے طبع آزمائی کی ہے۔ حاشئے پر جامِ سرشار (پنڈت رتن سرشار) رسالۂ کیمیا گری (ڈاکٹر مکند لال) اور تحفۃ العوام تین کتابوں کے اشتہار درج ہیں۔ آخر الذکر حضرت اہلِ سنت کے ضروری مسائلِ مذہبی پر مشتمل ایک مشہور و معتبر کتاب ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اشیاء کے اشتہارات بھی زینتِ حاشیہ ہیں۔

یہ رسالہ نامکمل ہے، آخر کے اوراق غالباً ضائع ہو گئے ہیں۔ شعرائے کرام میں انجم، بدر، ذبیح، رجا، سفلی، فریب، واصف[1]، بلال تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ سب اکبرآباد کے رہنے والے ہیں۔ دوسرے شعراء بھی بالعموم اکبرآباد سے وابستہ ہیں۔

اسی زمانے میں آگرے سے ایک دوسرا رسالہ "خیالِ یار" کے نام سے بھی نکلا کرتا تھا۔ اس کی پہلی جلد کا پہلا نمبر اس وقت سامنے ہے۔ رسالے کے نام کے اوپر گولائی میں The Khayal Yare بحروفِ انگریزی مرقوم ہے۔ اور نیچے یہ شعر ہے

نہ دو بالا ہو دل پہلو میں سینے میں جگر تڑپے
یہ وہ نالے ہیں جو اک دم سنے وہ دوپہر تڑپے

اس کے بعد ضوابط و قواعد مندرج ہیں کہ رسالہ ہر ماہ انگریزی کی ۱۵ تاریخ کو اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ غزلیات کے اشعار بعد انتخاب شاملِ رسالہ کئے جاتے تھے۔ جن کا انگریزی ماہ کی پہلی تاریخ کو مہتمم کے پاس پہنچ جانا ضروری تھا۔ غیر طرح کلام بلا انتخاب با اجرت فی شعر آدھ آنہ درج ہو سکتا تھا۔ چندہ عوام سے ایک روپیہ، رؤسا سے پانچ روپے اور گورنمنٹ انگلشیہ سے بارہ روپے سالانہ مقرر تھا۔ مہتمم اسکے میر نثار علی تھے اور یہی "مطبع نثار ہند اکبرآباد" کے مالک تھے جہاں یہ ماہ اشاعت پذیر ہوا کرتا تھا۔ "کٹرہ گاڑی بانان" میں اس کا مستقر تھا اور جملہ خط کتابت اسی پتے پر ہوا کرتی تھی۔

رسالۂ موجودہ میں صرف آٹھ صفحات محفوظ ہیں۔ اس لئے کل صفحات رسالہ کی تعداد نہیں بتائی جا سکتی۔ ان آٹھ صفحوں میں اٹھارہ شعرائے کرام کا کلام درج ہے۔ جن میں سے سید احمد مرزا جان آگاہ، خواجہ قمر الدین راقم اور محمد عاشق حسین عاشق، یہ تین غالب کے شاگرد اور سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا ظہیر دہلوی تلمیذ ذوق خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ محی الدین خاں تسنیم شاگرد فصاحت لکھنوی، سید زیرک حسین رضی تلمیذ مصحفی امروہوی، سید وحید الدین احمد بیخود نبیرۂ نصیر صاحب، مولانا احمد علی خاں عاصی بریلوی تلمیذ امیر لکھنوی، منشی عبدالکریم عروج بریلوی تلمیذ داغ، شیخ ریاض الدین فدا اکبرآبادی تلمیذ منشی محمد خاں رند اکبرآبادی اور دوسرے شعرا بھی زینتِ رسالہ ہیں۔ سب نے طرح میں غزلیں کہی ہیں۔ انہی میں ایک مزاحیہ غزل چوتیا بھرت پوری کی بھی ہے۔

مذکورۂ بالا دو رسالوں کے علاوہ آگرے سے نکلنے والے اُنیسویں صدی کے حسبِ ذیل رسائل بھی خصوصیت کے حامل ہیں۔ جن کی فہرست "ماہنامہ شاعر آگرہ نمبر" بابت ۱۹۳۶ء میں درج کی گئی ہے بغرض آگاہی اور ادب دوستی جنکو یہاں منتقل کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

معیار الشعرا	سنہ ۱۸۴۷ء	مولوی ابوالحسن
گلدستۂ شعراء	سنہ ۱۸۴۸ء	جگت نرائن
مسلم الجلد	سنہ ۱۸۵۶ء	سدا سکھ لال
آئینۂ علمت	نامعلوم	ڈاکٹر سید الطاف علی
مرقع	سنہ ۱۸۹۹ء	مرزا محمد زکریا ملک

یہ سارے رسالے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں اور ڈاسی نیز دیگر مورخین ادب نے اپنی تاریخوں میں ان کا ذکر ضرور کیا ہے اخبارات[2] آگرے سے نکلنے والے ان رسائل سے ماورا ہیں۔ نیز یہ کہ اس فہرست کو اکبرآباد سے نکلنے والے اس وقت کے سارے رسائل و اخبارات پر محیط نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان کے علاوہ بھی سُراغ ملتا ہے، چنانچہ ڈاسی نے بغاوت ہند، قانونی رسالہ اور آبِ حیات ہند ماہوار رسائل کا ذکر کیا ہے جو فہرست مذکور الصدر میں موجود نہیں اور یہی حال متعدد اخبارات کا ہے۔ (قاضی معراج دھولپوری)

---

[1] ان کا ایک شعر ملک میں خصوصی مقبولیت حاصل کر چکا ہے جو اس شعر پر ہے
آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما ۔ بس نازک است شیشۂ دل در کنار ما
یہ تربت شہیدناز معروف بالا جان گداز کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] آگرے سے نکلنے والے اخبارات کی فہرست رسائل سے زیادہ طویل ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔ زبدۃ الاخبار، اسعد الاخبار (۱۸۴۷ء) مطلع الاخبار (۱۸۵۰ء) منتخب الاخبار (۱۸۵۰ء) نزہت الارواح (۱۸۴۸ء) اخبار النواح (۱۸۵۰ء) گورنمنٹ آگرہ گزٹ (۱۸۵۰ء) نور الابصار (۱۸۹۲ء) مفید خلائق (۱۸۶۰ء) نور الاخبار (۱۸۵۲ء) اخبار حیدری (۱۸۶۲ء) اخبار حسینی (۱۸۶۳ء) خیر خواہ خلائق (۱۸۶۵ء) آئینۂ عالم (۱۸۹۶ء) اردو اخبار (سنہ ۱۹۰۱ء) آگرہ اخبار (۱۸۶۴ء) تیرھویں صدی (۱۸۹۵ء) نئی روشنی (۱۸۹۵ء) سرشتۂ روزگار، مفید عام، اور نسیم آگرہ بھی انیسویں صدی کے پرچے ہیں جن میں سے بعض قرنتین میں ان کا وجود پایا جاتا ہے۔

آل احمد سرور

تبصرہ

تاثرات و تعصبات

(از نظیر صدیقی ۵+۲۹۲ صفحے۔ قیمت سات روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ۔ پاک کتاب گھر ۳۹ پٹواٹولی ڈھاکا ۱)

تاثرات و تعصبات نظیر صدیقی کے دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ شروع میں "اعترافات" کے عنوان سے چند پتے کی باتیں کہی گئی ہیں جو مصنف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان مضامین میں ہمیں کسی خاص تنقیدی نظریے کی ترجمانی نہیں ملتی، ہاں قدر شناسی کی ایک مخلصانہ کوشش ملتی ہے۔

یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، جمیل رضوی، جگر مراد آبادی، ناسخ، اور رشید احمد صدیقی پر جو مضامین ہیں اُن میں قدرے تفصیل سے ان حضرات کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جمیل الدین عالی اور گنجے فرشتے پر تبصرے سرسری ہیں۔ آخر میں "کچھ اپنی صفائی میں" کہا گیا ہے جو مصنف کے انشائیوں کے ایک مجموعے "شہرت کی خاطر" پر کچھ تبصروں کا جواب ہے۔

نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ذوق پاکیزہ۔ گو ان کی بعض رایوں سے اختلاف ناگزیر ہے، مگر اس کے باوجود انھیں طرفداروں کے بجائے سخن فہموں کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایمان داری سے قدر شناسی (Appreciation) کی کوشش کرتے ہیں، یہ حسن و قبح کو پرکھتے ہیں اور اس کے بعد ایک فیصلہ بھی صادر کرتے ہیں۔ فیصلے سے اتفاق ہو یا اختلاف، لیکن ان کے طریقۂ کار سے اختلاف کی کم ہی گنجایش ہے۔ انھیں اپنے خیالات کو صاف ستھری زبان میں پیش کرنے کا گُر آتا ہے اور زبان کی اس دل کشی کی وجہ سے اُن کی تحریروں کے پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔

یگانہ پر انھوں نے بڑے مزے کا مضمون لکھا ہے اور اُن کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ وہ جو اقبال کی عظمت کے اور یگانہ کی صلاحیت کے قایل ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اقبال اور یگانہ کا یہ موازنہ گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے۔ یگانہ مجذوب ہیں اور اقبال سالک۔ مجذوب کی بڑ میں بھی بہت کچھ ہوتا ہے مگر راہ و رسم منزل سے سالک ہی باخبر ہوتا ہے۔ یگانہ کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ اقبال تو بہر حال ایک بڑے نصب العین کے عاشق تھے یگانہ اپنے عاشق ہیں۔ ان کی فکر بہت گہری نہیں، ہاں اُن کا لہجہ بڑا بانکا اور اُن کے تیور بڑے بانکے ہیں۔ نظیر صدیقی نے یہ غلط کہا کہ یگانہ کے اشعار یاد نہیں ہوتے۔ اُن کے یہ شعر تو بھلائے نہیں جاسکتے۔

پڑ شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے

آئینۂ دل کیا ہے، خاک ہے
پیچئے تو مہنگی ہے، بیچئے تو سستی ہے

ننگِ محفل مرا زندہ، مرا مردہ بھاری
کون اُٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

یگانہ کے محاوروں پر بھی اعتراض صحیح نہیں۔ انھوں نے بڑے سلیقے سے محاورے برتے ہیں اور انھیں کی بدولت یگانہ کے کلام میں ایک ایسا رس ہے جو کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ یگانہ یقیناً ہمارے ممتاز و منفرد شعرا میں سے ہیں گو اُن کے یہاں میرؔ، غالبؔ و اقبالؔ کی سی قوت شفا نہیں۔

یہی حال فراقؔ پر مضمون کا ہے۔ فراقؔ کی شاعری کی خوبیاں اور خامیاں نظیر صدیقی پر روشن ہیں۔ اُن کی یہ خواہش بھی درست ہے کہ کاش اُردو شعرا کی اُبھرتی ہوئی نسل فراقؔ سے مرعوب ہونے کے بجائے صرف اُن سے متاثر ہونے پر ہی اکتفا کرتی۔ مگر عشقیہ شاعری اور غزل کے متعلق فراقؔ کے خیالات سے اس مضمون میں انصاف نہیں کیا گیا۔ نظیر صدیقی صاحب نے اس پر غور نہیں کیا کہ غزل جو حدیث دلبری ہے، اگر یہ تصوف کے لئے موزوں ہے تو سیاسی و سماجی خیالات کے اظہار کے لئے کیوں موزوں نہیں اور جس طرح عاشق صرف ہمہ وقت عاشق ہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی سپاہی بھی ہو سکتا ہے، اسی طرح حسن کا ادا شناس، زندگی کے اسرار و رموز کا ذکر کیوں نہیں چھیڑ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کو صرف حکایت لب و رخسار سمجھنے ہی سے یہ الجھن پیدا ہوتی ہے ورنہ جہاں بھی گہرا جذبہ، شدید احساس اور ایک مقصد سے ہم آہنگ ہونے کا تصور۔ (Identification) پایا جائے وہ عشقیہ شاعری کہلائے گی۔

فیض پر مضمون میں تاثرات سے زیادہ تعصبات کی جھلک نظر آئی۔ فیض کے یہاں زبان کی خامیاں ہیں مگر اُس کے یہاں جو جادو ہے اُس کے مقابلے میں ان خامیوں کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ فیض کی مقبولیت کا راز نظیر صدیقی کے نزدیک ان کے تغزل میں ہے۔ یہاں تغزل سے زیادہ غنائیت کی اصطلاح موزوں معلوم ہوتی ہے۔ نیاز صاحب کی سند کی نظیر صدیقی کو ضرورت نہ ہونی چاہئے تھی کیونکہ قدیم شاعری کے متعلق اُن کی رائے مستند ہو تو ہو مگر جدید شاعری کی روح کو وہ پا نہیں سکے ہیں۔

نظم ملاقات پر اُن کے عمل جراحی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ انھیں نظم اس طرح پڑھنی چاہئے تاکہ وہ اس سے پورا لطف لے سکیں۔

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں میں
لاکھ مشعل بکف ستاروں کے کارواں
گھِر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے میں
اپنا سب نور رو گئے ہیں
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں کے گلستاں میں
سلگ رہا ہے
الم نصیبوں، جگر فگاروں کی صبح،
افلاک پر نہیں ہے

فیض کی زبان پر اعتراض کرتے وقت ایک بات نہیں بھولنا چاہئے۔ فیض جس نسل کے شاعر ہیں وہ اپنے کلاسیکل سرمائے سے واقف ہے،

مگر اس کے گرد و پیش کی زبان خاصی بدل گئی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ فیض کی غلطیاں غلطیاں نہیں، مگر یہ معنی ضرور ہیں کہ یہ غلطیاں ایسی اہم نہیں کہ نیاز صاحب کی طرح، نظیر صدیقی ان کی اصلاح کی ہمت کریں۔ کیونکہ جگر یا فیض کی اصلاح کرنے سے ممکن ہے اُن کی غلطیاں دور ہو جائیں مگر غلطیوں کے ساتھ اُن کے اشعار کی وہ کیفیت بھی جاتی رہتی ہے۔

اصغر، فانی اور جگر کے کلام پر تبصرہ مجموعی حیثیت سے بہت خوب ہے اِن اللہ ما یہ عرض ہے کہ شعلۂ نوا پر اُردو ادب میں اس مجموعے کی اشاعت کے بعد ہی تبصرہ ہوا تھا۔

نظیر صدیقی نے ناسخ پر مضمون میں اُس رجحان کو تقویت دی ہے جو ناسخ کو سرے سے نظر انداز نہیں کرتا۔ عمومی طور پر یہ رجحان صحت مند ہے کیونکہ ناسخ کی خوبیوں سے یکسر انکار کرنا، اُس اثر سے انکار کرنا ہے جو ناسخ کے فکر و فن کی وجہ سے اُن کے ہم عصروں پر پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناسخ اپنے دور کی ایک بڑی شخصیت تھے اور فن کی برگزیدگی اور عظمت کو انھوں نے بڑے بڑوں سے منوایا۔ لیکن چونکہ اُن کے یہاں کسی گہرے عقیدے یا جذبے کا سایہ نہیں ملتا اس لئے اُن کا کلام پختگی، مشاقی، ہمواری، آرائش و زیبائش، ترصیع بلکہ صنائع کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ تاثیر، جادو، کیفیت کے لحاظ سے اس کی اہمیت زیادہ نہیں، اُن کے یہاں آتش سے زیادہ چستی اور ہمواری ہے مگر اُن سے کم تاثیر اور کیفیت۔ حالی کے اثر سے نقادوں نے انھیں یکسر نظر انداز کر دیا تھا، اب اُن کی اہمیت کا اعتراف غلط نہیں ہے، مگر ناسخ شاعر سے زیادہ اُستاد فن ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزل پر غزل کہتے جھجکاتے تھے۔

نظیر صدیقی رشید احمد صدیقی کے بڑے مداح ہیں اور انھوں نے اپنے ممدوح کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دی ہے، مگر اس مضمون کے شروع میں ایک بنیادی غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"اُردو نثر میں اگر کسی نے غزل گوئی کی ہے تو وہ رشید صاحب ہیں" اُن کا خیال یہ ہے کہ بڑے پتے کی بات ہے اور اچھی بات ہے حالانکہ نثر میں غزل گوئی کر کے کوئی اچھا نثار نہیں ہو سکتا۔ دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ رشید صاحب بہت اچھے نثر نگار ہیں، اس لئے اُن کی خوبی نثر میں غزل گوئی میں نہیں، نثر میں غزل گوئی کے باوجود ہے۔ بنیادی طور پر رشید صاحب مضمون نگار اور انشا پرداز ہیں۔ مضمون میں شخصی نقطۂ نظر سب سے اہم ہے اور اس کی کارفرمائی میں اس منطقی تسلسل اور ربط بیان کی ضرورت نہیں جو کسی علمی مضمون میں ہوتا ہے۔ یہی اُن کے بہکنے کا جواز ہے۔ مگر لغزش کو سلامت روی کہنا صحت نظر کی دلیل نہیں۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ رشید صاحب کے یہاں حسن پیدا ہے۔ رشید صاحب اپنی تحریروں پر خاصی توجہ کرتے ہیں اور ان کی حک و اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، لیکن اسے ان کی خوبی سمجھنا چاہئے۔ بے ساختگی کو ہر حال میں سراہنے والے فطرت اور فن کے فرق سے ناواقف ہیں۔

نظیر صدیقی نے رشید احمد صدیقی کے لاجواب فقروں کی جی کھول کر داد دی ہے لیکن ان فقروں پر وہ غور کرتے تو یہ راز بھی کھل جاتا کہ رشید صاحب کیوں جتنے بڑے مضمون نگار اور انشا پرداز ہیں اتنے بڑے نقاد نہیں ہیں۔

تنقید میں ٹھنڈک اور گرم پانی کی بوتل دونوں میں توازن ضروری ہے۔ رشید صدیقی کے یہاں گرم پانی کی بوتل اپنی بھرپور صلاحیت دکھاتی ہے۔ اُن کی ٹھنڈک پوری مکمل ہوئی نہیں ہے۔ اس لئے اُن کے مزاحیہ مضامین اور ان کے خاکوں کا درجہ جتنا بلند ہے اُن کی تنقیدوں کا نہیں۔

رشید صدیقی کے اسلوب کا اثر ہم سب پر پڑا ہے۔ نظیر صدیقی بھی اس سے بچ نہیں سکے ہیں۔ تنقید میں یہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اس کا اندازہ نظیر صدیقی کے اس جملے سے کیجئے کہ "اردو ادب میں رشید صاحب پہلے اور تنہا شخص ہیں جس نے طنز و مزاح کو فلسفہ اور فلسفے کو آرٹ بنایا" مزاح نہ فلسفہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے اور نہ اس سے اس کی عظمت کم ہوتی ہے۔ مزاح نگار افراط و تفریط، نشیب و فراز کی طرف اشارہ کر کے ہمیں ایک ذہنی توازن کی طرف لے جاتا ہے۔ رشید صاحب کو فلسفی قرار دینا اُن پر تہمت لگانا ہے۔ اگر رشید صاحب فلسفی ہیں تو اکبر بھی فلسفی ہیں۔ دراصل دونوں صاحب نظر ہیں۔ دونوں کی نظر ہمہ گیر نہیں، مگر اپنے دائرے میں گہری ہے اور یہی اُن کی عظمت کا راز ہے۔

رشید صدیقی کی مرقع نگاری پر بعض باتیں بڑی پتے کی کہی گئی ہیں لیکن مصنف نے راقم الحروف کے اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ کیوں ذاکر صاحب کا خاکہ سلیمان اشرف کے خاکے کی طرح جاندار نہیں ہے۔ رشید صاحب کے یہاں ذاکر صاحب کی شخصیت کی دلکشی آگئی ہے، اُن کے کردار کی تندی اور گرمی کا حق ادا نہیں ہوا۔ سلیمان اشرف کی کردار نگاری جو کچھ چاہتی تھی وہ رشید صاحب نے فراہم کر دیا۔ ذاکر صاحب کی سیرت کا مرقع جیسے درکار تھا وہ اطلاع کرتا ہے۔

ٹکھا اپنی صفائی میں، بہت دلچسپ مضمون ہے اور اس سے نظیر صدیقی کی نظر کی صحت ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ شہرت کی خاطر یہ مضمون نگاری (یا آج کل کی چلتی ہوئی اصطلاح انشائیہ) کا معیار کیا ہے اور نظیر صدیقی کا اس صنف میں کیا کارنامہ ہے۔ وہ مضمون نگاری کی روح، اُس کے دائرے اور اُس کے فن سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں اور ان کے معترضوں کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مضمون نگار نہیں ہیں۔ افسوس ہے کہ کچھ لوگ کسی کی طنز نگاری کی بنا پر اُسے مضمون نگار ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، اور کسی کی تنقید کی خوبی کی وجہ سے اسے مضمون نگاروں کی برادری سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس مضمون میں مضمون نگاری کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ ذوق سلیم کی اچھی مثال ہے۔

"تاثرات و تعصبات" مجموعی طور پر نہایت قابل قدر مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہاں تنقیدی صلاحیت، گہرا تاثر، حسن و قبح پر نظر ڈالنے کی کوشش اور ان سب کے ساتھ ایک پاکیزہ اور دلکش اسلوب مل جاتا ہے۔ مصنف کی رایوں سے اختلاف تو کیا ہی جائے گا، مگر ان کے سنجیدہ خیالات کی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ان کی شرقیت کی طرف سے ضرور خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کچھ اور وسعت اور لچک آ جائے تو تنقید کی دنیا میں اُن کے لئے روشن مستقبل ہوگا۔

مالک: انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر: نذیر حسن، پرنٹر: ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا